اداریہ

ہمارا نصابِ تعلیم

ادھر کئی ماہ سے سرکاری مدارس میں پڑھایا جانے والا نصابِ تعلیم زیرِ بحث ہے۔ خاص طور پر اسلامیات اور پاکستانیات کے مضامین۔ بعض اہلِ قلم کی رائے میں اس نصاب کو سیکولر بنایا جا رہا ہے، اسی لیے بہ قول ان کے اسلامیات کے مضمون میں جہاد سے متعلق اسلامی تعلیمات کو ختم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ دوسرے اہلِ علم کا جو ترقی پسند یا لبرل کے نام سے جانے جاتے ہیں، کہنا ہے کہ اسلامیات، معاشرتی علوم، مطالعۂ پاکستان جس انداز سے پڑھائے جا رہے ہیں، وہ ایک صحت مند طرزِ فکر نہیں ہے۔ اس سے غیر مسلم طلبہ اور بھارت کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ایسے ہی غیر مسلم طلبہ کے لیے اسلامیات کا مضمون لازمی قرار دینا درست نہیں ہے۔

ہمارے تعلیمی نصاب کے بارے میں ان دونوں حضرات (روایت پسند اور ترقی پسند اہلِ قلم) کے افکار کو کراچی کے مجلّہ Herald، اپریل ۲۰۰۴ء اور South Asian Journal، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۳ء، لاہور اور The Subtle Subversion[1] میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نصابِ تعلیم کا مسئلہ ایک پرانا مسئلہ ہے، جس پر برصغیر کے ممتاز اہلِ علم اظہار ہوئیں اور انیسویں صدی سے لکھ رہے ہیں اور سرکاری سطح پر پاکستان میں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی حکومتوں نے (۱۹۹۱ء-۱۹۹۹ء) بھی اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قومی کمیشن قائم کیے۔ مسلم لیگ کے دور میں اس کمیشن کے چیئرمین قومی اسمبلی کے رکن جناب سیّد سجاد حیدر

(1) The State of Curricula and Textbooks in Pakistan, Editors: A.H. Nayyar and Ahmad Salim. Islamabad, P.O.Box: 2342.

اور پیپلز پارٹی کے عہد میں جناب غضنفر علی گل تھے۔ پورے ملک سے دانش گاہوں کے وائس چانسلرز، دانش ور اور اہلِ علم اس کمیشن میں شامل تھے، مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر انیتا غلام علی، جناب الٰہی بخش سومرو، محمد علی ہوتی، راجہ ظفر الحق، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مذہبی علماء میں سے مرحوم پیر کرم شاہ، مفتی محمد رفیع عثمانی اور چند دوسرے علمائے کرام اس کمیشن کے ممبر تھے۔ خاکسار بھی ممبر تھا۔ کمیشن کے اجلاس اسلام آباد میں برابر ہوتے رہے۔ افسوس! دونوں عہد میں (مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی) تعلیمی نصاب سے متعلق کوئی متفقہ دستاویز تیار نہ ہوسکی جو خالص علمی نقطۂ نظر سے ایسی دستاویز ہوتی جو ہماری صحت مند علمی، فکری، اخلاقی روایات کی حامل اور جدید فکری تقاضوں کی ترجمان ہوتی۔

اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ کئی محترم حضرات کمیشن کے اجلاس میں بہ وجوہ شریک نہ ہو سکے، مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال جو ہمارے قومی مسائل میں ایک صحت مند نقطۂ نظر رکھتے ہیں، کسی بھی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ پروفیسر انیتا غلام علی پہلے اجلاس میں شریک ہوئیں، ان کے ہاتھ میں سائنس کی ایک نصابی کتاب تھی، جس پر قرآن مجید کی یہ آیت درج تھی: وجعلنا من الماء کل شی حی۔ (الانبیاء:۳۰) کیا اس طرح ہم سائنس کو مشرف بہ اسلام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس طرزِ فکر یا طرزِ عمل پر اُن کا تبصرہ وزنی تھا۔ اس کے بعد وہ بھی کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئیں۔ غرض ان حضرات کے نہ آنے سے قومی کمیشن ان کے قیمتی مشوروں اور تعلیمی تجربوں سے محروم رہا۔

مسلم لیگ کے دور میں کمیشن نے ایک رپورٹ بھی لکھی، جس پر بات چیت کرنے کے لیے کمیشن کے ارکان ۱۹۹۲ء میں وزیر اعظم (نواز شریف) سے ملے اور ان کے ساتھ چاروں صوبوں کے وزرائے تعلیم یا سیکرٹری تعلیمات بھی اجلاس میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کمیشن کی رپورٹ کو پڑھا تو وزیر اعظم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''موجودہ وقت میں (اس وقت بدقسمتی سے چترال میں شیعہ سنی فساد ہوا تھا) جو حادثہ ہوا ہے، اس پر کچھ نہیں کہا گیا کہ آخر اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کے خاتمے کے لیے (قومی درسگاہوں میں) کیا کچھ کیا

جانا ضروری ہے۔

ایک سفارش یہ بھی تھی کہ میٹرک کے بعد انگریزی مضمون کو اختیاری مضمون اور سول سروس کے امتحان میں اُردو مضمون کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ اگر انگریزی پڑھنا لازمی مضمون نہ رہا تو وہ بیرونِ ملک جا کر کس زبان میں بات کریں گے؟

غرضیکہ وزیرِ اعظم اور ان کے ساتھیوں کو کمیشن کی سفارشات پسند نہ آئیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خاکسار نے کمیشن کے اجلاس میں کہا تھا کہ سول سروس کے امتحان میں اُردو زبان میں کامیابی لازمی ہو، لیکن اسے ڈویژن میں شمار نہ کیا جائے تاکہ جن امیدواروں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے، انہیں صرف ڈویژن کی وجہ سے دوئم یا سوئم درجے میں نہ رکھا جائے، نیز یہ کہ وزیرِ اعظم سے تفصیلی ملاقات سے پہلے ٹھوس سفارشات کے لیے مزید کام ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر این۔ بلوچ نے اُردو سے متعلق خاکسار کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔

یہاں اس ملاقات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی حکومتیں اخلاص سے یہ چاہتی تھیں کہ ہمارے تعلیمی نصاب کو ٹھوس بنیادوں پر تیار کیا جائے، چنانچہ وزارتِ تعلیم نے تمام حضرات کو نہ صرف ۱۹۴۸ء سے گزشتہ صدی میں تیار ہونے والی تعلیمی رپورٹوں کی کاپیاں فراہم کیں، بلکہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں مثلاً چین، جاپان میں پڑھائے جانے والے مضامین، خاص طور پر بچوں کی اخلاقی تربیت سے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات بھی فراہم کیں۔ کمیشن کے پہلے اجلاس (ستمبر ۱۹۹۱ء) کو اس وقت کے وزیرِ تعلیم فخرِ امام نے خطاب کیا جو مغز تھا۔ وزارتِ تعلیم نے اپنی ایک تعلیمی رپورٹ بھی ممبروں کو فراہم کی، جسے وزارت کے اعلیٰ افسروں؛ ڈاکٹر قاضی، چوہدری منیر احمد، پروفیسر لئیق احمد نے تیار کیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے عہد میں کمیشن کے چیئرمین جناب غضنفر علی گل تھے۔ ایک دن کمیشن کے اجلاس میں چیئرمین کے ساتھ ایک صاحب تشریف لائے جو کمیشن کے ممبر نہیں تھے۔ اُنہوں نے اپنا فلسفہ ''Islamisation of Knowledge'' پیش کیا۔ یہ فلسفہ مرحوم اسماعیل راجی فاروقی

نے پیش کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں اسلام آباد میں ایک مذاکرہ بھی ہوا تھا جس میں جنرل موصوف کے ساتھ ساتھ بروہی صاحب بھی تھے، جو اس فلسفہ کے بڑے مداح تھے۔ خاکسار نے ڈاکٹر فاروقی سے کہا کہ آپ نے ۱۹۶۰ء میں انگریزی میں 'العروبۃ' کے نام سے کتاب لکھی تھی، کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اسی فلسفہ کو آگے بڑھاتے۔ موجودہ موضوع ''علم کو اسلامی بنانا'' فکری ژولیدگی کا باعث بنے گا۔ قرآن مجید میں صرف 'علم' آیا ہے۔ رب زدنی علمًا۔ (الکھف: ۱۱۴) حدیث میں آیا ہے: ''من علم لاینفع'' (میں ایسے علم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں (اعوذبک) جو بے سود ہے۔) جونہی علم پر اجلاس میں بات چیت ہوئی تو سیکولرازم کی بحث چھڑ گئی۔ ایک محترم ممبر نے فرمایا کہ لاہور میں لڑکیوں کے ایک معروف کالج کو بند کر دیا جائے کیونکہ وہ ہمارے نظریۂ حیات کے برعکس سیکولر تعلیم دے رہے ہیں۔ چنانچہ اس نئے موضوع پر تفصیلی بحث ہوئی، جس میں خاکسار نے بتایا کہ سیکولرازم کے بنیادی خصائص کیا ہیں اور اس کے نام پر ایک کامیاب کالج کو بند کرنے کا بہانہ نہ بنایا جائے۔ اگر سیکولرازم کی سیڑھی پر چڑھ کر ہم چاند تک پہنچ جائیں تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔

قومی کمیشن کے علاوہ وزارتِ تعلیم کے جوائنٹ سیکرٹری اور ان کے رفقاء میٹرک، ایف۔اے اور بی۔اے میں اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کے نصاب سے متعلق اساتذہ سے بات چیت کرتے رہے۔ اُنہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ سکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جانے والا کورس بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ اساتذہ کو جو نصاب سازی میں شریک ہوتے تھے، اپنے افکار ونظریات کو بیان کرنے کی پوری آزادی تھی۔ اس بات چیت میں گوجرانوالہ میں کرسچین سنٹر سے ڈاکٹر داؤد (David) ایسے ہی ہندو برادری کے ایک استاد بھی آتے رہے۔ اس اجلاس میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ مسیحی اور ہندو بچوں کے لیے مذہبی سبق خود ان کے ہم مذہب پادری یا پنڈت لکھیں۔ اس حقیقت کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ کمیشن کوئی متفقہ دستاویز نہ لکھ سکا جو طالب علموں کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کر کے عہدِ جدید میں ان کے فکری اور اخلاقی کردار کو واضح کر سکے۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ

ساتھ قومی کمیشن کے اراکین میں پہلا سا جوش وخروش باقی نہ رہا اور اجلاس میں آنا بند ہوتا گیا۔

بیسویں صدی کے اختتام پر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری چیئرمین مقرر ہوئے تو انہوں نے اگست ۲۰۰۰ء میں اسلام آباد میں ایک اجلاس بلایا۔ خاکسار بہ وجوہ دوبارہ قومی کمیشن کے کسی اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر انصاری نے از راہِ کرم 'عبوری رپورٹ برائے تعلیم کی اسلامی تشکیل' (۲۰۰۰ء) کی ایک کاپی خاکسار کو بھی بھجوائی۔

بے شبہ یہ دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے کہ جو قومی کمیشن ۱۹۹۱ء میں وجود میں آیا تھا، وہ تقریباً دس سال تک کوئی مربوط تعلیمی رپورٹ نہ لکھ سکا، جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کی ثنویت کو ختم کرنے پر سنجیدگی سے بحث کی گئی ہوتی۔ اگر ہمارے معروف دینی ادارے بوجوہ تعلیم کے عصری تقاضوں کو اپنے نصاب میں جذب نہ کر سکے تو جدید تعلیمی ادارے اپنے جدید نصابِ تعلیم میں روایتی علوم کو خاص طور پر فقہ، کلام اور تفسیر کو آسانی سے جذب کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں انہیں 'مرحوم دہلی کالج (انجمن ترقیٔ اُردو، دہلی) اور مناظر احسن گیلانی کی تحریروں سے مدد مل سکتی تھی۔ اس طرح مسلم جماعت تعلیم میں اپنی تاریخی وحدت کو برقرار رکھ سکتی تھی۔ ہمیں اس بات پر بھی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ آخر ہم ۵۷ سال کے بعد بھی اپنے بچوں کو مفت پرائمری اور ثانوی تعلیم سے مسلح نہ کر سکے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ہم نے پہلی بار ۱۹۷۳ء کے دستور میں پرائمری اور ہائی اسکول کی تعلیم کو لازمی قرار دیا اور بجٹ میں ایک کثیر رقم رکھی گئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں رکھی گئی تھی۔ اگر یہ پالیسی جاری رہتی تو آج پاکستان میں بھارت کی طرح پرائمری تعلیم سو فیصد ہوتی۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ کمیشن کے اجلاسات میں لاہور میں دی جانے والی A لیول یا O لیول کی مہنگی تعلیم کبھی زیرِ بحث نہیں آئی۔ کیا یہ تعلیم ہمارے پڑوس میں (دہلی، کلکتہ) بھی دی جا رہی ہے؟ اگر ہماری معیشت اور تعلیم صحیح خطوط پر استوار اور جاگیردارانہ کلچر سے آزاد ہوتی جیسا کہ اقبال و جناح چاہتے تھے تو آج دُنیا میں نہ سہی، جنوب ایشیا کی قوموں میں ہمارا سر بلند ہوتا۔

اس دستاویز کے نہ آنے سے یہ نقصان بھی ہوا کہ پڑھایا جانے والا نصاب برابر مخل

نزاع رہا اور تنقید کا نشانہ بنتا رہا۔

ڈاکٹر کے۔ کے عزیز نے ''تاریخ کا قتل'' اور اے۔ ایچ نیّر اور احمد سلیم نے The State of Curricula and Textbooks in Pakistan میں تفصیل سے بتایا ہے کہ ہم نے مڈل یا میٹرک میں تحریکِ پاکستان کو بیان کرتے ہوئے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ نصابِ تعلیم میں ان اصلاحی کوششوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہاں امریکہ کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امریکہ میں نبراسکا (Nebraska) یونیورسٹی نے ۱۹۸۰ء میں نصابی کتابیں دری اور پشتو زبان میں شائع کیں، جنھیں امریکن افغانستانی ماہرین نے لکھا تھا۔ نبراسکا یونیورسٹی کے اس ''اصلاحی قدم'' پر اس وقت یہاں کوئی آواز نہیں اُٹھی۔[1] امریکہ کے ساتھ ساتھ اب کراچی میں آغا خان یونیورسٹی کی خاموش تعلیمی خدمات کو بھی 'سیاسی نگاہ' سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس طرزِ عمل سے کوئی مسئلہ حل ہو یا نہ ہو، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ اندازِ بیان ہماری فکری اور تعلیمی زندگی کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس سے ہماری علمی، ثقافتی اور سیاسی فکر نے جو زخم کھائے ہیں، اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اسلامیات کے قدیم نصاب کو (جو درسِ نظامی کے نام سے معروف ہے) علماء نے فرسودہ قرار دیا ہے اور سرکاری اسکولوں میں جو نیا نصاب پڑھایا جا رہا ہے، وہ ایک 'سیاسی نظریہ' میں ڈھل کر اپنی سچائی اور روحانیت کھو بیٹھا ہے۔

پہلے مسئلہ پر ابوالکلام آزاد نے سچ لکھا ہے: ''ایک ایسا فرسودہ نظامِ تعلیم جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے سرتاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص، درس و املاء کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔''[2] مولانا نے یہی بات ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کانفرنس میں کہی، فرماتے ہیں: ''افسوس! درسِ نظامی ہماری ضروریات کی ہرگز کفایت نہیں کرتا۔ ہم معقولات کی

---

(۱) ملاحظہ ہو: پاکستان: مدارس اور انتہاپسندی، جولائی ۲۰۰۲ء، اسلام آباد۔ برسل، No.36، ایشیا رپورٹ، I.C.G۔

(۲) غبارِ خاطر، دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۹۷ (مالک رام ایڈیشن)۔

تعلیم میں ساری دُنیا سے ڈیڑھ سو برس پیچھے ہیں۔ ہمیں زمانہ کی رفتار کو پیشِ نظر رکھنا ہی پڑے گا۔'' یہی بات ہمارے جدید نصاب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب جامعہ الازہر، قاہرہ میں نصاب تعلیم میں اصلاح کا مسئلہ اُٹھا اور بار بار کہا گیا کہ اس نصابِ تعلیم سے نہ تو علم حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی عربی زبان میں مہارت، تو اصلاح کا عمل شروع ہوا جو برابر جاری رہا۔ نصاب میں حساب، ہندسہ، طبعیات وغیرہ مضامین کا اضافہ کیا گیا اور یہ اصول مان لیا گیا: ''اگر کسی علم کے پڑھنے پر کوئی دُنیاوی یا دینی مصلحت موقوف ہو تو پھر اس علم کا پڑھنا واجب ہے۔'' اس کے باوجود جب شیخ انبابی سے کہا گیا کہ مقدمہ ابنِ خلدون کو داخلِ نصاب کیا جائے تو شیخ موصوف نے کہا کہ ایسا کرنا ہماری روایت کے خلاف ہوگا۔(۱) شیخ محمد عبدہ نے بھی علمایے ازہر سے ایسا ہی مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اسے ردّ کر دیا گیا تھا۔(۲)

عہدِ حاضر کی یہی معروف شخصیت ہے، جس نے کہا تھا: ''یہ مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ قرآن کی تفسیر میں جو کچھ (عربی زبان میں) لکھا گیا ہے، اس کی ایک بڑی تعداد قرآن کے پڑھنے والے کو ان بلند مقاصد — حکمت و تدبر، عبرت و نصیحت، خشیت و عاجزی، مقدور بھر خدائی احکام کو بجالانا، اور برائیوں سے رُکنا — سے دُور رکھتی ہے۔(۳)

شیخ محمد عبدہ نے تفسیر المنار میں یہ جو لکھا ہے کہ تفسیروں کی اکثریت انسان اور قرآن کے درمیان حجاب بن کر رہ گئی ہیں، ابوالکلام آزاد نے اسی المیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں لکھا: ''اُنہوں (مفسرین کی اکثریت نے) جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اُتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔'' اس موضوع پر مزید لکھتے ہیں: ''زمانہ کی بدذوقی نے بھی ہر بدمذاقی کو سہارا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تدریس کے لیے وہی

(۱) الصعیدی، عبدالمتعال: تاریخ الاصلاح فی الازھر، قاہرہ، ص ۲۴۶-۲۴۷۔

(۲) دوج (Bayad Dodge): Al-Azhar، واشنگٹن، ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۲۔

(۳) تفسیر المنار، بیروت ایڈیشن، طبع ثانیہ، ج ۱، ص ۷۔

تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں، وقت کا یہ سوءِ انتخاب ہر علم وفن میں جاری رہا جو زمانہ جرجانی پرسکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا۔ یقیناً اس کے دربار سے جلالین ہی کو حسنِ قبول کی سند مل سکتی تھی۔''(۱)

اسلامیات کے نصاب میں میٹرک یا ایف۔اے میں بچوں کے لیے قرآن مجید کی جو سورتیں رکھی گئی ہیں، خاکسار نے ان کے بارے میں متعدد نشستوں میں کہا تھا کہ چند مختصر سورتیں (قرآن مجید کے آخری پارے سے) پڑھائی جائیں تاکہ وہ نماز میں پڑھ سکیں، جہاں تک ان کے ترجمہ وتفسیر کا تعلق ہے، مثلاً میٹرک یا ایف۔اے میں تو وہاں ''بہ قول ابن العربی سب سے پہلے عربی زبان اور شاعری پڑھائی جانی چاہیے کیوں کہ عرب زندگی کا ریکارڈ ہے... اس کے بعد حساب، قرآن مجید اور دوسرے علوم پڑھائے جائیں۔ قاضی ابن العربی نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بچوں کو عربی زبان پڑھائے بغیر قرآن پاک پڑھایا جاتا ہے، جسے وہ سمجھتے تک نہیں۔''(۲) ابنِ خلدون نے اس طریقِ تدریس کو سراہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ۵۷ سال میں اسلامیات و پاکستانیات کے نصاب میں جو ناکام تجربے کیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنِ تدریس کے قواعد وضوابط کی پیروی کیے بغیر چارہ نہیں۔ تعلیمی تجربوں کی ناکامی کا ان کے صحیح تناظر ہی میں جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ جو بھی راہ اختیار کی جائے گی، وہ 'حجاز' کو نہیں ترکستان کو جائے گی۔ اس مناسبت سے ایک واقعہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ۱۹۷۶ء میں لاہور میں ایک تعلیمی کانفرنس پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین کی صدارت میں ہوئی۔ اس اجلاس میں تعلیم کی اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے محکمۂ تعلیم (لاہور) کے ایک پروفیسر نے فرمایا: ''مشرقی پاکستان کے المیہ کی ذمہ داری ان غیر مسلم اساتذہ پر ہے جو سکولوں، کالجوں میں طالب علموں میں نظریۂ پاکستان کی بجائے

---

(۱) ترجمان القرآن، ج ۱، (طبع ملی، پہلا ایڈیشن) ص ۱۷۔ (اصول وترجمہ) اس موضوع پر اسعید نی نے تاریخ الاصلاح فی الازہر میں سکاکی اور تفتازانی کی کتابوں پر تنقید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کتابوں کو تیمور لنگ کی فکر کے بعد علمی درس گاہوں میں قبولیت حاصل ہوئی ہے۔

(۲) مقدمہ، فصل فی تعلیم الصبیان۔

اپنے افکار پھیلاتے تھے۔ اس موضوع پر فاضل مقرر نے اپنی خطابت کے جوہر دکھائے۔ جب خاکسار کی باری آئی تو غریب شہر نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں تو غیر مسلم اساتذہ ''فساد کا باعث'' بنے، لیکن یہاں لاہور کی درس گاہوں میں جہاں سارے اساتذہ مسلمان ہیں، جو کرپشن پائی جاتی ہے، امتحانات میں دھاندلی ہوتی ہے، کلاسوں میں اساتذہ تیاری کر کے نہیں جاتے تو یہاں کی کرپشن کے اسباب کا بھی سراغ لگائیں۔ اور واقعات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھیں۔ انہیں فرقہ وارانہ رنگ دے کر اپنی ناکامی کے اصلی اسباب سے تغافل نہ برتیں۔

جس طرح ہم نے مرحوم مشرقی پاکستان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کی صحیح تصویر کھینچنے میں ٹھوکریں کھائیں اور ان کے جائز قومی مطالبے ماننے سے انکار کیا، پھر جو ہوا، سو ہوا۔[1] اسی طرح ہم نے پنجاب میں ۱۹۴۷ء کے خونی فسادات کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے غیر انسانی کردار کا ذکر تو کیا۔ لیکن مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے (ہندو اور سکھ) ساتھ وہی سلوک کیا تھا، جو مشرقی پنجاب میں ان کے ساتھ ہندو اور سکھوں نے کیا تھا۔ لیکن اس کتاب میں مغربی پنجاب کے فسادات پر کچھ نہیں لکھا گیا۔[2]

ایسے ہی اس کتاب (تحریکِ پاکستان برائے جماعت نہم و دہم، از پروفیسر اکرام علی ملک، سید قمر عباس) میں گاندھی جی کو ایک اعتدال اور امن پسند رہنما کی بجائے ایک بنیاد پرست اور انتہا پسند لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا گیا کہ وہ (گاندھی جی) مسلمانوں کو بچاتے ہوئے ایک جنونی ہندو کے ہاتھ سے قتل ہو گئے۔[3] اس واقعہ پر پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) نے کہا تھا کہ اگر پاکستان میں ہندوؤں کو بچاتے ہوئے کوئی مسلم رہنما قتل ہو جاتا تو بھارت میں ہمارا سر بلند ہو جاتا۔

یہاں ہم نے اپنے نصابِ تعلیم سے چند مثالیں پیش کی ہیں، جن میں حقیقت کا ایک

---

(1) تفصیل کے لیے دیکھیے: اے۔ ایچ۔ کاردار 'ناکام اُمیدیں' (Failed Expectations)، لاہور، ۱۹۹۵ء، نیز دیکھیے المعارف جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء، اداریہ 'ہماری تعلیم اور زندگی'۔

(2) The State of Curricula and Textbooks in Pakistan, P 71

(3) Ibid, P 70

ہی رُخ پیش کیا گیا ہے جو ہماری بلند اخلاقی و جمالیاتی قدروں کی ترجمانی نہیں کرتا۔

ہرچند آج پاکستان میں ہمارے نوجوانوں کی اکثریت ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے محروم رہی اور تعلیم سے متعلق قدیم اور جدید نقطہ ہائے نظر میں پوری طرح مفاہمت نہ ہوسکی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ حکومت نے مختلف عہد میں اصلاح کے لیے قومی کمیشن مقرر کیے، ایسے ہی تعلیمی بورڈ بھی، جنھوں نے سرکاری مدارس میں پڑھائے جانے والے معاشرتی علوم کا تنقیدی جائزہ لیا اور بتایا کہ سچائی، حقیقت اور بلند اخلاقی قدروں سے عاری تعلیم قومی مسائل کا حل نہیں۔ ہم جتنی جلدی پروپیگنڈے اور کھوکھلے نعروں سے اپنا رشتہ توڑ لیں، اسی قدر یہ امر ہماری فکری، اخلاقی اور تخلیقی زندگی کے لیے بہتر ہوگا۔ بے شبہ ''مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو بلند نظر ہیں اور اللہ کے بندوں سے پیار کرتی ہیں۔''

رشید احمد (جالندھری)